فلسطین پر اسرائیلی جارحیت

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ ○

□ 'مطالبۂ پاکستان' کو یہود کے 'قومی وطن' سے تشبیہ دینا غلط ہے [۱۹۴۴ء]

سوال: مسلمان، آدم علیہ السلام کی خلافتِ ارضی کا وارث ہے۔ مسلمان کی زندگی کا مقصد صرف اللہ پاک کی رضا اور اس کے مقدس قانون پر چلنا اور دوسروں کو چلنے کی ترغیب دینا ہے۔ لیکن مسٹر محمد علی جناح اور مسلم لیگی بھائی پاکستان کا قیام چاہتے ہیں، ہندستان کی زمین کا ایک گوشہ، تاکہ ان کے خیال کے مطابق مسلمان چین کی زندگی گزار سکیں۔

کیا خالص دینی نقطۂ نظر سے یہ مطالبہ قابلِ اعتراض نہیں ہے؟ یہودی قوم مقہور و مغضوب قوم ہے۔ اللہ پاک نے اس پر زمین تنگ کر دی ہے اور ہر چند کہ اس قوم میں دُنیا کے بڑے سے بڑے سرمایہ دار اور مختلف علوم کے ماہرین موجود ہیں، لیکن اُن کے قبضے میں ایک انچ زمین بھی نہیں ہے۔ آج وہ اپنا قومی وطن بنانے کے لیے کبھی انگریزوں سے بھیک مانگتے ہیں اور کبھی امریکاوالوں سے۔ میرے خیال میں مسلمان، یا بالفاظِ دیگر آل انڈیا مسلم لیگ بھی یہی کر رہی ہے۔ تو پھر کیا یہ ایک مقہور اور مغضوب قوم کی پیروی نہیں ہے؟

○ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی (۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء-۲۳ ستمبر ۱۹۷۹ء) نے مسئلہ فلسطین، یہودیت اور اسرائیلی جارحیت پر لکھا بھی ہے اور خطبات بھی دیے ہیں۔ مختلف نشستوں اور مصاحبوں میں سوالات کے جواب بھی دیے ہیں۔ یہاں ترجمان القرآن میں شائع شدہ سوال و جواب اور ۱۹۶۷ء میں دو خطوط سے اقتباسات درج کیے جا رہے ہیں، جن میں مسئلے کی وضاحت کی گئی ہے۔ (ادارہ)

جواب: میرے نزدیک پاکستان کے مطالبے پر، یہودیوں کے قومی وطن کی تشبیہ چسپاں نہیں ہوتی:

فلسطین فی الواقع یہودیوں کا قومی وطن نہیں ہے، اُن کو وہاں سے نکلے ہوئے دو ہزار برس گزر چکے ہیں۔ اُسے اگر اُن کا قومی وطن کہا جاسکتا ہے، تو اُسی معنی میں جس معنی میں جرمنی کی آریہ نسل کے لوگ وسطِ ایشیا کو اپنا قومی وطن کہہ سکتے ہیں۔ یہودیوں کی اصل پوزیشن یہ نہیں ہے کہ ایک ملک [فلسطین] واقعی اُن کا قومی وطن ہے اور وہ اسے تسلیم کرانا چاہتے ہیں، بلکہ ان کی اصلی پوزیشن یہ ہے کہ ایک ملک ان کا قومی وطن نہیں ہے، اور اُن کا مطالبہ یہ ہے کہ ''ہم کو دنیا کے مختلف گوشوں سے سمیٹ کر وہاں بسایا جائے اور اُسے بزور ہمارا قومی وطن بنادیا جائے''۔

بخلاف اس کے، مطالبۂ پاکستان کی بنیاد یہ ہے کہ ''جس علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے، وہ بالفعل مسلمانوں کا قومی وطن ہے''، اور مسلمانوں کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ ''موجودہ جمہوری نظام میں ہندستان کے دوسرے حصوں کے ساتھ لگے رہنے سے، اُن کے قومی وطن کی سیاسی حیثیت کو جو نقصان پہنچتا ہے، اُس سے اس کو محفوظ رکھا جائے، اور متحدہ ہندستان کی ایک آزاد حکومت کے بجاے، 'ہندو ہندستان' اور 'مسلم ہندستان' کی دو آزاد حکومتیں قائم ہوں۔ یعنی بالفاظِ دیگر وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ''ان کا قومی وطن جو بالفعل موجود ہے، اُس کو اپنی آزاد حکومت الگ قائم کرنے کا حق حاصل ہوجائے''۔

یہ چیز بعینہٖ وہی ہے، جو آج دُنیا کی ہر قوم چاہتی ہے۔ اور اگر مسلمانوں کے مسلمان ہونے کی حیثیت کو نظرانداز کر کے انھیں صرف ایک قوم کی حیثیت سے دیکھا جائے، تو اُن کے اِس مطالبے کے حق بجانب ہونے میں کوئی کلام نہیں کیا جاسکتا۔ ہم اصولاً اس بات کے مخالف ہیں کہ دُنیا کی کوئی قوم کسی دوسری قوم پر سیاسی و معاشی حیثیت سے مسلط ہو۔ ہمارے نزدیک اصولاً یہ ہر قوم کا حق ہے کہ اس کی سیاسی و معاشی باگیں اس کے اپنے ہاتھوں میں ہوں۔ اس لیے ایک قوم ہونے کی حیثیت سے اگر مسلمان یہ مطالبہ کرتے ہیں تو جس طرح دوسری قوموں کے معاملے میں یہ مطالبہ صحیح ہے، اسی طرح ان کے معاملے میں بھی صحیح ہے۔ (ترجمان القرآن، جولائی - اکتوبر، ۱۹۴۴ء، ص ۱۰۳-۱۰۴)

□ مسئلہ فلسطین اور جماعت اسلامی [۱۹۴۶ء]

سوال: فلسطین کی سیاست میں امریکا اور برطانیہ کی خودغرضانہ دخل اندازی اور اسلام دشمنی کے نتائج واضح ہیں۔ جماعت اسلامی کی قضیۂ فلسطین کے سلسلے میں پالیسی کیا ہے؟

جواب: ہمارے نزدیک برطانیہ اور امریکا سخت ظلم کر رہے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ فلسطین کے معاملے میں انھوں نے بے انصافی کی حد کردی ہے۔ اہلِ فلسطین سے ہمدردی کرنا ہر انسان کا انسانی فرض ہے، اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ فرض کئی گنا زیادہ سخت ہوجاتا ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہمدردی کریں۔ پھر فلسطین کا مسئلہ اس لیے بھی اہم ہے کہ اگر خدانخواستہ وہاں یہودی ریاست بن گئی، تو اس سے مرکز اسلام، یعنی حجاز کو بھی متعدد قسم کے خطرات لاحق ہوجائیں گے۔ اس معاملے میں دُنیا کے مسلمان مدافعت کے لیے جو کچھ بھی کریں، ہم ان کے ساتھ ہیں۔

ہمارے نزدیک اصل مسئلہ کفر و اسلام کی کش مکش کا ہے اور ہم اپنا سارا وقت، ساری قوت اور ساری توجہ اسی مسئلے پر صرف کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ (ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۴۶ء، ص ۲۵۱-۲۵۲)

□ ظلم اور جارحیت کے رکھوالے [۱۹۶۷ء]

[۳۰/اگست ۱۹۶۷ء کو ایک خط کے جواب میں لکھا:]

کشمیر کے معاملے میں پاکستان کو جو تجربہ پچھلے [چند برسوں] سے ہو رہا ہے اور عرب ممالک کو اسرائیلی جارحیت کے بعد جو تجربہ ہوا ہے، اس نے یہ بات بالکل واضح کردی کہ دُنیا میں آج بھی 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس' کا قاعدہ ہی جاری ہے۔ آج بھی قوت ہی حق ہے، اور کسی قوم کے لیے اس کی اپنی طاقت کے سوا اس کے حقوق کی حفاظت کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد دنیا کو ایک فریب 'مجلس اقوام' کے نام سے ایک انجمن بنا کر دیا گیا، مگر بہت جلدی یہ بات کھل گئی کہ 'بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند'۔ پھر دوسری جنگ عظیم کے بعد دوسرا فریب 'اقوام متحدہ' کی تنظیم قائم کر کے دیا گیا، مگر آج کسی سے بھی یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ یہ تنظیم چند بڑی طاقتوں کے

ہاتھ میں ایک کھلونا ہے، جسے وہ حق اور انصاف کے لیے نہیں بلکہ اپنی مصلحتوں کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ ظالم کا ہاتھ پکڑنا اور مظلوم کا حق دِلوانا تو درکنار، یہ تنظیم تو ظالم کو ظالم کہنے تک کے لیے تیار نہیں ہے۔ بلکہ اب تو کھلم کھلا مظلوم کو 'حقیقت پسندی' کا درس دیا جارہا ہے، جس کے معنی صاف صاف یہ ہیں کہ مظلوم اپنی کمزوری اور ظالم کی زورآوری کو ایک امر واقعہ کی حیثیت سے تسلیم کرے، اور ظالم نے طاقت کے بل بوتے پر اس کا جو حق مار کھایا ہے، اس پر صبر کرے۔

ان حالات میں یہ اُمید کرنا بالکل لاحاصل ہے کہ کشمیر میں ہندستان نے اور شرقِ اوسط میں اسرائیل نے جو غاصبانہ دست درازیاں کی ہیں، ان کا تدارک محض حق و انصاف کی بنیاد پر کوئی بین الاقوامی طاقت کرائے گی۔ یہاں اخلاق کا نہیں بلکہ جنگل کا قانون جاری ہے۔ ہمیں خدا پر بھروسا کر کے اپنی طاقت ہی سے غاصبوں کی ان زیادتیوں کا تدارک کرنا ہوگا، اور ان کا تدارک جب بھی ہوگا بزورِ شمشیر ہی ہوگا۔ (مکاتیب سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، اوّل ص ۲۰۹-۲۱۱)

□ اسرائیلی جرائم میں مسیحی دنیا کی حصّے داری [۱۹۶۷ء]

[رومن کیتھولک مسیحی سربراہ پوپ پال ششم کے نام دسمبر ۱۹۶۷ء کے خط میں لکھا:]

مسیحی دُنیا کے متعلق مسلمانوں کا عام احساس یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک شدید جذبۂ عناد رکھتی ہے، اور آئے دن ہمیں ایسے تجربات ہوتے رہتے ہیں، جو اس احساس کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ اس کا تازہ ترین تجربہ وہ ہے جو [جون ۱۹۶۷ء] میں عرب اسرائیل جنگ کے موقعے پر ہوا۔ اس لڑائی میں اسرائیل کی فتح پر یورپ اور امریکا کے بیش تر ملکوں میں جس طرح خوشیاں منائی گئیں، انھوں نے تمام دنیا کے مسلمانوں کے دل میں زخم ڈال دیے ہیں۔ آپ شاید ہی کوئی مسلمان ایسا پائیں گے، جس نے عربوں کی شکست اور اسرائیل کی فتح پر مسیحی دُنیا کے اس علی الاعلان اظہارِ مسرت و شادمانی اور اسرائیل کی کھلی کھلی حمایت کو دیکھ کر یہ محسوس نہ کیا ہو کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مسیحیوں کے گہرے جذبۂ عناد کا مظاہرہ تھا۔

فلسطین میں اسرائیل کی ریاست جس طرح بنی ہے، بلکہ بنائی گئی ہے۔ اس کی تاریخ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ دوہزار برس سے فلسطین عرب آبادی کا وطن تھا۔ موجودہ [۲۰ویں] صدی

کے آغاز میں وہاں یہودی ۸ فی صدی سے زیادہ نہ تھے۔ اس حالت میں برطانوی حکومت نے اس کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کا فیصلہ کیا اور 'مجلسِ اقوام' نے نہ صرف اِس فیصلے کی توثیق کی بلکہ برطانوی حکومت کو فلسطین کا مینڈیٹ دیتے ہوئے یہ ہدایت کی وہ یہودی ایجنسی کو باقاعدہ شریکِ حکومت بنا کر اس تجویز کو عملی جامہ پہنائے۔ اس کے بعد دُنیا بھر کے یہودیوں کو لا لا کر، ہر ممکن تدبیر سے فلسطین میں بسانے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا، یہاں تک کہ ۳۰ سال کے اندر ان کی آبادی ۳۳ فی صدی تک پہنچ گئی۔ یہ ایک صریح ظلم تھا، جس کے ذریعے سے ایک قوم کے وطن میں زبردستی ایک دوسری اجنبی قوم کا وطن بنایا گیا۔ پھر ایک دوسرا اس سے بھی زیادہ ظالمانہ قدم اُٹھایا گیا اور امریکا نے کھلے بندوں دباؤ ڈال کر اقوامِ متحدہ سے یہ فیصلہ کرایا کہ یہودیوں کے اس مصنوعی قومی وطن کو یہودی ریاست میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس فیصلے کی رُو سے ۳۳ فی صدی یہودی آبادی کو فلسطین کا ۵۵ فی صدی، اور عربوں کی ۶۷ فی صدی آبادی کو ۴۵ فی صدی رقبہ الاٹ کیا گیا تھا۔ لیکن یہودیوں نے لڑ کر طاقت کے بل پر اس ملک کا ۷۷ فی صدی رقبہ حاصل کر لیا اور مار دھاڑ اور قتل و غارت کے ذریعے سے لاکھوں عربوں کو گھر سے بے گھر کر دیا۔ یہ ہے اسرائیل کی اصل حقیقت۔ کیا دُنیا کا کوئی انصاف پسند اور ایمان دار آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک جائز ریاست ہے جو فطری اور منصفانہ طریق سے بنی ہے؟

اس [اسرائیل] کا تو عین وجود ہی ایک بدترین جارحیت ہے۔ اور اس پر مزید ظلم یہ ہے کہ یہودی صرف اُن حدود کے اندر محدود رہنے پر بھی راضی نہیں ہیں، جو انھوں نے فلسطین میں زبردستی حاصل کی ہیں، بلکہ وہ سالہا سال سے علانیہ کہہ رہے ہیں کہ نیل سے فرات تک کا پورا علاقہ ان کا قومی وطن ہے۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ یہ قوم ہر وقت یہ جارحانہ ارادہ رکھتی ہے کہ اس پورے علاقے پر جبراً قبضہ کرے اور اس کے اصل باشندوں کو زبردستی نکال کر، دُنیا بھر میں پھیلے ہوئے یہودیوں کو وہاں لا کر بسائے۔

اسی جارحانہ اسکیم کا ایک جز گذشتہ ماہِ جون [۱۹۶۷ء] کا وہ اچانک حملہ تھا، جس کے ذریعے سے اسرائیل نے ۲۶ ہزار مربع میل علاقے پر قبضہ کیا۔ اس پورے ظلم کی ذمہ دار مسیحی دُنیا ہے۔ اُس نے ایک قوم کے وطن میں ایک دوسری قوم کا وطن زبردستی بنوایا۔ اُس نے اس مصنوعی

قومی وطن کو ایک ریاست میں تبدیل کرایا۔ اُس نے اِس جارح ریاست کو روپے اور ہتھیاروں سے مدد دے کر اتنا طاقت ور بنایا کہ وہ زبردستی اپنے توسیعی منصوبوں کو عمل میں لا سکے۔ اور اب اس ریاست کی تازہ فتوحات پر یہی مسیحی دُنیا جشنِ شادمانی منا رہی ہے۔

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد نہ صرف عربوں میں، بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں مسیحیوں کی انصاف پسندی، اُن کی خیر اندیشی اور مذہبی عناد و تعصب سے اُن کی بریت پر کوئی اعتماد باقی رہ گیا ہے؟ اور کیا آپ کا خیال ہے کہ دُنیا میں امن قائم کرنے کے یہی طریقے ہیں؟ یہ دراصل ہمارا نہیں بلکہ آپ کا کام ہے کہ مسیحی بھائیوں کو اِس رَوش پر شرم دلائیں اور ان کی روح کو اِس گندگی سے پاک کرنے کی کوشش کریں۔ (مکاتیب سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، اوّل ص ۲۲۱-۲۲۳)

□ اسرائیل کے حق میں ایک عجیب مذہبی استدلال [۱۹۷۶ء]

سوال: سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۱۰۴ کے متعلق اخبار صدق جدید (لکھنؤ) میں مولانا عبدالماجد دریابادی [۱۶ مارچ ۱۸۹۲ء-۶ جنوری ۱۹۷۷ء] نے یہ تشریح کی ہے کہ ''اس میں وَعْدُ الْاٰخِرَةِ سے یَوْمُ الْاٰخِرَةِ نہیں ہے بلکہ قیامت کے قریب ایک وقت موعود ہے اور جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا سے مراد بنی اسرائیل کے مختلف گروہوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دینا ہے''۔ پھر جناب دریابادی فرماتے ہیں کہ ''مطلب واضح ہے، یعنی اسرائیلیوں کو بعدِ واقعۂ فرعون کی خبر دے دی گئی تھی کہ اب تو تم آزاد ہو، دُنیا میں جہاں چاہو رہو بسو، البتہ جب زمانہ قربِ قیامت کا آجائے گا تو ہم تم کو مختلف سمتوں سے، مختلف ملکوں سے، مختلف زبانیں بولتے ہوئے، مختلف وضع و لباس اختیار کیے ہوئے، سب کو ایک جگہ جمع کر دیں گے اور وہ جگہ اور کون سی ہوسکتی ہے بجز ان کے قدیم وطن ملک فلسطین کے۔ آج جو ارضِ فلسطین میں یہود کا اجتماع ہر ہر ملک سے ہو رہا ہے، کیا یہ اسی غیبی پیش خبری کا ظہور نہیں؟'' مولانا دریابادی صاحب کی اس تشریح سے ڈر ہے کہ یہ فلسطین کے متعلق عام جذبۂ جہاد کو ٹھنڈا کر دے گا۔

جواب: آیتِ مذکورہ کی اس تشریح کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ آیت کے الفاظ تو صرف یہ ہیں کہ:

وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ﴿۱۰۴﴾ (بنی اسرائیل ۱۷:۱۰۴)[1] اور اس کے بعد (یعنی فرعون کی غرقابی کے بعد) ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ زمین میں رہو بسو، پھر جب آخرت کے وعدے کا وقت آئے گا تو ہم تم کو اکٹھا کرلائیں گے۔

ان الفاظ میں 'قربِ قیامت کے وقتِ موعود' اور بنی اسرائیل کے وطنِ قدیم میں یہودیوں کے مختلف گروہوں کو ملک ملک سے لاکر جمع کردینے کا، مفہوم آخر کہاں سے نکل آیا؟ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ کا سیدھا اور صاف مطلب آخرت کا وعدہ ہے، نہ کہ 'قیامت کے قریب زمانے کا کوئی وقتِ موعود'۔ اور سب کو اکٹھا کرکے لانے یا جمع کرلانے سے مراد قیامت کے روز جمع کرنا ہے۔ اس میں کوئی اشارہ تک اس بات کی طرف نہیں ہے کہ اسی دنیا میں بنی اسرائیل کو ایک جگہ جمع کیا جائے گا۔

اس پر مزید ستم یہ ہے کہ ''ایک جگہ جمع کرنے'' کے تصور کو آیت کے الفاظ میں داخل کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ [مولانا دریابادی صاحب نے] یہ بھی طے کردیا [ہے] کہ وہ جگہ 'اسرائیلیوں کے وطنِ قدیم' کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ یہ تو بعینہٖ یہودیوں کے اس دعوے کی تائید ہے کہ 'دو ہزار برس تک فلسطین سے بے دخل رہنے کے باوجود اُس پر ان کا حق فائق ہے، کیونکہ وہ ان کا وطن قدیم ہے، اور اب دو ہزار برس سے یہ ملک جن لوگوں کا حقیقت میں وطن ہے، ان کے مقابلے میں برطانیہ اور روس اور امریکا نے نہیں، بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے اس سرزمین پر یہودیوں کے حقِ سکونت کو فائق قرار دے کر انھیں ہر ملک سے وہاں جمع کروایا ہے'۔ اس طرح تو 'اسرائیلی ریاست کا قیام اللہ تعالیٰ کے ایک وعدے کا نتیجہ قرار پاتا ہے، نہ کہ دنیا کی ظالم قوموں کی ایک سازش کا'۔

---

[1] مولانا امین احسن اصلاحیؒ [۱۹۰۴-۱۵دسمبر ۱۹۹۷ء] لکھتے ہیں: ''فرعون کو غرق کرنے کے بعد یہ بنی اسرائیل پر انعام ہوا کہ اللہ نے ان کو ارضِ مقدس میں بسایا۔ الارض سے مراد یہاں قرینہ دلیل ہے کہ ارضِ مقدس ہے، جس کا بنی اسرائیل سے وعدہ تھا۔ اس وعدے کو پورا کرتے وقت اللہ نے ان کو آخرت کا وعدہ بھی یاد دلا دیا تھا کہ اس کامیابی کی خوشیوں میں آخرت کو نہ بھول جانا۔ جس طرح اپنے وعدے کے مطابق ہم تم کو سمیٹ کر یہاں لائے ہیں، اسی طرح اپنے وعدے کے بموجب ایک دن سمیٹ کر حساب کتاب کے لیے حشر کے میدان میں جمع کریں گے۔ لیکن بنی اسرائیل، اللہ تعالیٰ کی اس یاددہانی کو بالکل بھول گئے۔ (تدبر قرآن، ج ۴، ص ۵۴۵)

حالانکہ آیت کے الفاظ میں اس مفہوم کے لیے قطعاً کوئی گنجایش نہیں ہے۔ (ترجمان القرآن، جون ۱۹۷۶ء، ص ۳۸-۳۹)

□ امریکا کی جانب سے اسرائیل کی غیر اخلاقی حمایت [۱۹۷۷ء]

سوال: اسرائیلی وزیراعظم مناخم بیگن [۱۹۱۳ء-۱۹۹۲ء] نے اپنے دورۂ امریکا کے فوراً بعد حال ہی میں تین غیر قانونی یہودی بستیوں کو دریائے اُردن کے مغربی کنارے پر قانونی حیثیت دی ہے۔ مزید برآں اسرائیلی حکومت تین اور نئی بستیاں مغربی کنارے پر بسا رہی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کا ردِعمل کیا ہے؟

جواب: امریکی حکومت اگر انصاف اور اخلاق کے تمام اصولوں کو نظرانداز کر کے یہودیوں کی بے جا حمایت اور امداد و اعانت کرنے پر تلی ہوئی نہ ہوتی، تو اسرائیل کبھی اتنا جری و بے باک نہ ہوسکتا تھا کہ پے درپے ایک سے ایک بڑھ کر ڈاکازنی اور غصب و ظلم کے جرائم کا ارتکاب کرتا چلا جاتا۔ اس لیے مَیں 'اصل مجرم امریکا کی بے ضمیری' کو قرار دیتا ہوں، جسے ساری دنیا کے سامنے اس جرائم پیشہ ریاست کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے ادنیٰ سی شرم تک محسوس نہیں ہوتی۔

امریکا، یہودیوں سے اس حد تک دبا ہوا ہے کہ اسرائیلی وزیراعظم کی آمد کے موقعے پر ان کے مذہبی پیشوا اور بااثر لیڈر، امریکی صدر پر ہجوم کر کے آتے ہیں۔ [اسرائیلی وزیراعظم] بیگن کی پذیرائی کے لیے اس پر دباؤ ڈالتے ہیں اور اس کو در پردہ ہی نہیں اشاروں کنایوں میں یہ احساس بھی دلا دیتے ہیں کہ 'جسے امریکا کا صدر بننا ہو، وہ یہودی ووٹوں کا محتاج ہے'۔ اس پس منظر میں انسانی حقوق اور اخلاق و انصاف کے دعوے دار [امریکی صدر] جمی کارٹر صاحب، بیگن کے اس انتہائی بے شرمانہ بیان کو شیرمادر کی طرح نوش فرما لیتے ہیں کہ ''دریائے اُردن کے مغربی جانب کا فلسطین، جو ۱۹۶۷ء کی جنگ میں عربوں سے چھینا گیا تھا، وہ [اسرائیل کے زیرتسلط کوئی] مقبوضہ (occupied) علاقہ نہیں ہے، بلکہ آزاد کرایا ہوا (liberated) علاقہ ہے اور یہ ہماری میراث ہے، جس کا وعدہ چار ہزار برس پہلے بائبل میں ہم سے کیا گیا تھا، اس لیے ہم اسے نہیں چھوڑیں گے''۔

یہ کھلی کھلی بے حیائی کی بات، امریکی حکام اور عوام سب کے سب سنتے ہیں اور کوئی پلٹ کر

نہیں پوچھتا کہ بائبل کی چالیس صدی قدیم بات آج کسی ملک پر ایک قوم کے دعوے کی بنیاد کیسے بن سکتی ہے؟ اور ایسی دلیلوں سے اگر ایک قوم کے وطن پر دوسری قوم کا قبضہ جائز مان لیا جائے تو نہ معلوم اور کتنی قومیں اپنے وطن سے محروم کردی جائیں گی۔ (ترجمان القرآن، اکتوبر ۱۹۷۷ء، ص ۴۱-۴۲)

□ مسجدِ اقصیٰ کی دیواروں کے نیچے کھدائی [۱۹۷۷ء]

سوال: مسجد اقصیٰ کی دیواروں کے نیچے اسرائیل کھدائی جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس سے مسجد کو سخت خطرہ لاحق ہے۔ اس بارے میں آپ اظہارِ خیال فرمائیں۔

جواب: مسجد اقصیٰ میں جو اکھیڑ پچھاڑ یہودی کر رہے ہیں، اور جو کچھ وہ الخلیل میں مسجد ابراہیمی کے ساتھ کر چکے ہیں، اس کی کوئی روک تھام، بیانات اور قراردادوں اور اقوام متحدہ کے فیصلوں سے نہیں ہوسکتی۔ یہودی یہ سب کچھ طاقت کے بل پر کر رہے ہیں اور وہ طاقت اس کو امریکا بہم پہنچا رہا ہے۔ جب تک ہم امریکا پر یہودیوں کے دباؤ سے بڑھ کر دباؤ ڈالنے کے قابل نہ ہوجائیں، اس ڈاکازنی کا سلسلہ نہیں رُک سکتا۔ (ترجمان القرآن، اکتوبر ۱۹۷۷ء، ص ۴۲)

تحریک اسلامی کی پیش رفت

- مولانا مودودی مرحوم نے جو اسلامی لٹریچر تخلیق کیا ہے، میرا یہ ایمان ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے مسلمانوں میں الحاد و لادینیت اور دہریت کو فروغ نہیں مل سکتا۔ اگر مولانا کا یہ عظیم الشان لٹریچر موجود نہ ہوتا تو اب تک جدید تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کا بڑا طبقہ اسلام سے بےگانہ ہو چکا ہوتا۔
- تحریک اسلامی کی دوسری چیز جس نے مجھے متاثر کیا، اس کی مثالی تنظیمی ہیئت ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ کڑے سے کڑے حالات میں بھی یہ اپنی تنظیمی ہیئت کو بطریق احسن برقرار رکھنے میں کامیاب رہی ہے۔
- تحریک اسلامی کی تیسری متاثر کن خوبی اس کی وسعت ظرف ہے۔ یہ تحریک اسلامی کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کو فقہی مسلکوں کی بنیاد پر آپس میں اُلجھنے کے بجائے اختلافِ مسلک کے باوجود اقامتِ دین کی جدوجہد میں ایک دوسرے کے دوش بدوش چلنا سکھایا ہے۔
- تحریکِ اسلامی کی چوتھی خوبی یہ ہے کہ اس نے دنیا کے مختلف حصوں میں لاکھوں کی تعداد میں ایسے افراد کو تیار کیا ہے، جو نہ صرف یہ کہ اسلام کا صحیح فہم اور شعور رکھتے ہیں بلکہ اسلامی نظام کے قیام کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھ کر اس کے لیے اپنی ہر متاع نچھاور کر دینے کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی آرزو سمجھتے ہیں، جنھیں کسی طاقت سے دبا کر اور کسی قیمت سے خرید کر اپنے موقف سے دستبردار نہیں کیا جا سکتا۔

معروف نومسلم ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمیؒ، انٹرویو اُردو ڈائجسٹ، جنوری ۱۹۷۸ء

عطیۂ اشتہار: صوفی بابا